پردے کا آسیب

پروفیسر آزر نفیسی

ترجمہ: محمد سعید

میں اپنی بات کی ابتداء مصوری کے ایک نمونے سے کروں گی، یہ ایڈگر ڈیگاس کا شہکار ہے، جس کا عنوان ہے: ''مے کدہ میں محو رقص حسینائیں'' - یہ نمونہ اسلامی جمہوریہ ایران میں فن پر چھپنے والی ایک کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ دو پیراگرافوں میں ڈیگاس کی رقاصاؤں کی تصویر کشی کی وضاحت کی گئی ہے۔ تصویر دائیں جانب اوپر کے چوتھائی حصہ کو دکھا کر باقی کینوس خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ہر چیز معمول کے مطابق معلوم ہوتی ہے، بغور جائزہ لینے پر شہکار اور اُس سے متعلقہ تفصیلات کے معاملے میں ایک بات پریشان کن حد تک غلط ہے۔ ایک ایسی بات جس نے شہکار اور اس سے متعلق سنجیدہ مباحث کو مضحکہ خیز حد تک غیر حقیقی بنا دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ تصویر سے رقاصاؤں کو سنسر کر دیا ہے اس کے بجائے آپ کو خالی جگہ، فرش، خالی دیواریں اور شراب کا کاؤنٹر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ستم ظریفی دیکھیے کہ سینسر کے اس عمل نے رقاصاؤں کو غائب کر کے لوگوں میں ان کے لیے تجسس اور زیادہ ابھار دیا ہے۔ گویا کہ ناچنے والیوں نے غائب ہو کر اپنی موجودگی کو زیادہ آب و تاب سے ظاہر کیا ہے۔ اس طرح ۱۹۷۹ء کے ایرانی انقلاب کی بیسویں ایرانی سالگرہ کے موقع پر ڈیگاس کا شہکار ایران میں زندگی کے بنیادی تضاد کی علامت بن کر ابھرا ہے۔

مذہبی حکمران ایرن میں عورت کو مکمل طور پر دبانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جب تک عورتیں اپنے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ پورے جسم کو کپڑے میں ڈھانپ نہ لیں اس وقت تک عورتیں پبلک مقامات پر نہیں جا سکتیں۔ عام سرکاری اداروں، یونیورسٹیوں اور ہوائی اڈوں پر ان کے داخلے کی جگہ الگ ہے۔

---

* Azar Nafisi, "The Veiled Threat," *The New Republic*, Feb 22, 1999. pp 24-29

جہاں لپ سٹک اور فتنہ سامانی نسواں کے دوسرے ہتھیاروں کی اُن سے تلاشی لی جاتی ہے۔ کوئی خلاف ورزی اتنی چھوٹی نہیں کہ اُسے نظر انداز کردیا جائے۔ وہ یونیورسٹی جہاں میں پڑھایا کرتی تھی، وہاں پر ایک خاتون کو ایک معمولی قہقہہ بار قسم کے لطیفے پر سزا دی گئی۔ حال ہی میں ایک خاتون پروفیسر کو یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ اس خاتون کا جرم اتنا تھا کہ تختہ سیاہ پر لکھتے ہوئے اس کی آستین سے اس کی کلائی نظر آ ئی۔ ان اقدامات کا مقصد عورت کو معاشرتی زندگی سے غائب کرنا اور بے وقعت بنانا ہے۔ لیکن اس کے برعکس، ایرانی عورت حیرت انگیز حد تک نمایاں اور طاقت ور ہوتی جارہی ہے۔ خواتین کی زندگی کے ہر پہلو کو کنٹرول کرنے کی کوشش میں عورت کے ہاتھ ایک طاقت ور ہتھیار آ گیا ہے۔ یہ ہتھیار حکمرانوں نے بادلِ نخواستہ دیا ہے۔ کسی بھی سرکاری ضابطے کی خلاف ورزی پر انفرادی فعل یا اشارے کا مطلب ایک طاقت ور سیاسی عمل ہے۔ عورتوں کی زندگی میں حکمران ٹولے کے انتہائی ضوابط نے آ گے بڑھ کر مردوں کی زندگی میں بھی جبری مداخلت شروع کردی ہے۔ جن کا مطلب یہ ہے کہ مردوں کی زندگی کا ہر وہ فعل جس کا تعلق عورت سے ہے اس معاملے کی نگرانی کی جاتی ہے۔ اس طرز عمل کے نتیجے میں نا صرف عورتیں، بلکہ وہ مرد بھی، جنہوں نے انقلاب کی حمایت کی تھی پیچھے ہٹ گئے ہیں، اور حکمران ٹولہ تنہا رہ گیا ہے۔

مذہبی حکمران ایرن میں عورت کو مکمل طور پر دبانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جب تک عورتیں اپنے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ پورے جسم کو کپڑے میں ڈھانپ نہ لیں اس وقت تک عورتیں پبلک مقامات پر نہیں جاسکتیں۔

مذہب پرست حکمرانوں، ان کے حامی عناصر اور معاشرے کے درمیان اس کھچاؤ کی شدت کا مغربی دنیا میں ایرانی امور کے ماہرین نے حقیقت سے کم اندازہ لگایا ہے۔ جس کی ایک ضمنی وجہ پچھلے بیس سالوں سے امریکی تجزیہ نگاروں، اساتذہ اور جلاوطن ایرانی برادری کی ایرانی معاشرے تک بہت کم رسائی ہے۔

اسی طرح انہوں نے ایران کے حکمران طبقے کے پیش کردہ تاثر پر نامناسب حد تک انحصار کیا ہے۔ اُس وقت یہ تاثر پہلے سے زیادہ فراخدلانہ انداز ہے، جسے ۱۹۹۷ء میں اعتدال پسند محمد خاتمی نے اپنی انتخابی

مہم میں قائم کیا تھا۔ جس کی حالیہ مثال سی این این کا یہ مسرت افزا نشریہ ہے کہ: ''ایران میں بیس سال بعد ہالی وڈ کی فلمیں دکھانا شروع کر دی گئی ہیں''۔ مگر سی این این وجوہات بتانے میں ناکام رہا ہے، وہ ہے ان فلموں کا ایرانی ایڈیشن۔ مثلاً Marry Poppins کی نمائش اصل فلم سے ۴۵ منٹ کم تھی۔ عورتوں کی کردار نگاری، اُن کے گانے اور رقص کو سنسر کر دیا گیا۔ اور اسے سکرین پر ایک ایرانی کی زبان میں بیان کیا گیا۔ کارٹون سلسلہ Popeye کے وہ تمام مناظر جن کا تعلق اُس کی محبوبہ اولیوائل اور پوپئی سے اس کے تعلقات سے ہے، اُنہیں واہیات قرار دے کر سنسر کر دیا گیا۔ جس وقت حکمران گروہ یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ اس نے امریکہ کے خلاف اپنا مخالفانہ مؤقف نرم کر دیا ہے، اس لمحے بھی ان ایرانیوں کے خلاف سزاؤں کو نرم نہیں کیا جنہوں نے امریکی ثقافت میں اپنی دلچسپی ظاہر کرنے کی جرات کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ صدر محمد خاتمی کے وزیر تعلیم نے اپنی تقرری کے فوراً بعد، طالب علموں پر لاطینی رسم الخط میں چھپا ہوا لٹریچر اور دوسری فرسودہ مغربی علامات کو کلاس روم لانے پر پابندی کے نئے احکامات جاری کیے ہیں۔

> عورتوں کی زندگی میں حکمران ٹولے کے انتہائی ضوابط نے آگے بڑھ کر مردوں کی زندگی میں بھی جبری مداخلت شروع کر دی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مردوں کی زندگی کا ہر وہ فعل جس کا تعلق عورت سے ہے اس معاملے کی نگرانی کی جاتی ہے۔

ریاستی تشدد کے بڑھتے ہوئے ان بہت سے طریقوں کی یہ تو نرم ترین مثالیں ہیں، جو خاتمی حکومت اپنے ساتھ لائی ہے، جس کا امتیازی نشان نئی فراخدلانہ پالیسی ہے۔ خاتمی کی کامیابی کے ساتھ بلاشبہ شہری آزادیوں کا ایک مختصر موسم بہار آیا۔ جس میں عوامی مظاہروں کے دوران آزادی گفتار کا اضافہ ہوا۔ نئے اخبارات جاری ہوئے لیکن یہ دور بھی حکومت کے تادیبی اقدامات سے ختم ہو گیا۔ اب تک اکثر اخبارات بند ہو چکے ہیں، ان کے مدیروں کو حراساں یا نظر بند کیا گیا ہے۔ حکومت کی فراخدلانہ پالیسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض ترقی پسند ملاؤں نے بھی مروجہ قانونی نظام پر تنقید کی مگر وہ گرفتار کر لیے گئے، اور ایک کو تو قتل بھی کر دیا گیا۔ حکمرانوں کو بہائی اقلیت کو بھی دبانے کا موقع مل گیا۔ اسی دوران ایرانی پارلیمنٹ نے جمہوریہ کی تاریخ میں عورتوں سے متعلق سب سے زیادہ رجعت پسند قانون بنایا ہے۔ اس قانون کے تحت طبی سہولتوں کی فراہمی کو جنس کی بنیاد پر الگ الگ کر دیا گیا ہے۔

ایک دوسرے قانون کے تحت رسائل و جرائد کے سرورق پر عورتوں کی تصاویر اور ایسے مضامین پر مؤثر پابندی عائد کردی گئی ہے، جن سے جنسی تناؤ پیدا ہو، یا وہ اسلامی قوانین کے خلاف ہو۔

> جس وقت حکمران گروہ یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ اس نے امریکہ کے خلاف اپنا مخالفانہ مؤقف نرم کر دیا ہے، اس لمحے بھی ان ایرانیوں کے خلاف سزاؤں کو نرم نہیں کیا جنھوں نے امریکی ثقافت میں اپنی دلچسپی ظاہر کرنے کی جرات کی تھی۔

حکومت کے دو مخالف قوم پرست رہنما: در یوش اور پروانہ فاروہر قتل کر دیے گئے۔ تین مشہور مصنفین غائب ہو گئے اور یہ تینوں بعد میں مردہ پائے گئے۔ بہت سے ایرانی مشتعل ہوئے، لاکھوں ایرانیوں نے خاموش احتجاج کے طور پر فاروہر کی تدفین میں شرکت کی۔ صدر خاتمی نے قتل کی مذمت کی اور تحقیقاتی کمیٹی قائم کی۔ کمیٹی نے پہلے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''قتل کے ذمہ دار وزارت اطلاعات کے ارکان ہیں''۔ لیکن چند دنوں بعد کمیٹی نے ایک دوسری کہانی پیش کر دی۔ جس میں ایک دوسرے خیال کو پیش کیا گیا کہ ''قتل وزارت اطلاعات کے کچھ لفنگوں نے کیا ہے اور یہ کہ قتل سیاسی نہیں ہے''۔ کمیٹی نے قاتلوں کے نام بھی ظاہر نہیں کیے، مقدمہ چلانا تو دور کی بات ہے۔ مشتعل ایرانیوں نے ترقی پسند اخبارات میں غم و غصے بھرے ٹیلی فون اور خطوط کا سیلاب برپا کر دیا۔

مغربی ذرائع ابلاغ نے اس کا نوٹس صرف اعتدال پسند خاتمی اور اس کے رجعت پسند ساتھیوں کے درمیان کشمکش کی حد تک لیا ہے۔ اکثر ذرائع ابلاغ نے جبر و تشدد کی کارروائیوں کو ''متشدد لوگوں کے خاتمی کے خلاف اقدام'' کے طور پر لیا ہے۔ گویا کہ اصل نشانہ ستم تو صدر خاتمی ہیں نہ کہ وہ لوگ جو قتل ہوئے یا ظلم کا نشانہ بنے۔ صدر خاتمی اور قدامت پسندوں کے درمیان اس کشمکش کی سادہ سی منظر کشی ایران کی تازہ ترین صورت حال کی غلط تفہیم پیش کرتی ہے۔ صدر خاتمی ایران میں حزبِ مخالف کی نمائندگی نہیں کرتے، اور نہ وہ کر سکتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ عوامی تائید حاصل کرنے کے لیے انھیں ایک انتخابی ایجنڈا پیش کرنا پڑا، جس میں اسلامی جمہوریہ کے بعض ستون گرانے کی بات شامل تھی۔ مگر انتخابات میں حصہ لینے کی اہلیت برقرار رکھنے کے لیے انھیں نقائص سے پاک سیاسی اور مذہبی سند درکار ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسی نظریہ حیات کی حفاظت کرنا ہے۔ اور اس کی سربلندی کے لیے کام کرنا ہے، جس نظام کی مخالفت اس

کے ووٹر بڑے جوش وخروش سے کرتے ہیں۔

صدر خاتمی کے دور حکومت نے اسلامی ریاست کو درپیش اہم ترین مخمصہ کو چاک کر دیا ہے۔ عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے حکومت کو لازماً اصلاحات نافذ کرنا ہوں گی۔ لیکن اپنی نفی کیے بغیر حکومت یہ اصلاحات نافذ نہیں کر سکتی۔ اس کا نتیجہ ایک انتشار ہے۔ ایک ایسا دور جس کی امتیازی خصوصیت اس کے واقعات کا بے ہنگم اور بے قاعدہ ہونا ہے۔ آج ایک آزادی عطا کی جاتی ہے، دوسرے دن پہلی آزادی منسوخ کر دی جاتی ہے۔ دونوں واقعات اس جدوجہد کی علامات ہیں جو ایران میں اس وقت جاری ہے۔

> ایران میں آزادیٔ نسواں کی حقیقی کہانی بیرونی سامراجی طاقتوں کے خارجی تصورات کا مسلط کرنا نہیں ہے۔ بلکہ آزادی نسواں کی ابتداء خود ایرانی خواتین کی طرف سے ایران کو جدید ملک بنانے کے لیے قومی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

محض صدر خاتمی اور رجعت پسند ملاؤں کے درمیان کشمکش نہیں بلکہ ایرانی عوام، حکومت اور نمائندگان کے درمیان اور اس جدوجہد کا مرکزی نقطہ حقوقِ نسواں کی جنگ ہے۔

ایک دوسرا عکس جو میرے ذہن کے پردے پر ابھرا ہے، وہ دورِ ماضی کی خاتون ڈاکٹر فاروخرو پارساء ہے۔ سنسر شدہ تصویر کی رقاصاؤں کی طرح، اُس کی موجودگی کا احساس اس کے غائب ہو جانے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ میں اُسے اپنے ذہن کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ فاروخرو پارساء کو تہران میں اس گرلز سکول کی پرنسپل بننے کی خاطر اپنی میڈیکل پریکٹس چھوڑنا پڑی، جہاں میں نے اپنے لڑکپن کے ایام میں تعلیم حاصل کی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا موٹا تازہ اور سنجیدہ چہرہ ابھی ابھی میری آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا ہے۔ وہ بالکل اُسی طرح کھڑی ہے جس طرح سکول کے باہر کھڑی ہوا کرتی تھی، اور سکول کی عمارت میں داخل ہونے والی طالبات کی نگرانی کرتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں ہمیشہ ایک خفگی ہوتی تھی، جیسے اسے خوف ہو کہ ہم اس کی مسکراہٹ کا فائدہ اٹھا کر اُس کے خواب کو توڑ دیں گے جو اس نے اس سکول کے لیے دیکھا تھا۔ وہ خواب، جو اس کا مقصدِ حیات تھا۔ جو اس نے ہم سب طالبات کے لیے دیکھا تھا۔ یعنی حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ بننے کا خواب۔ شاہ ایران کے دور میں ڈاکٹر پارساء پہلی خاتون تھی، جو ایرانی پارلیمنٹ کی رکن بنی۔ پھر ۱۹۶۸ء میں ایرانی کابینہ میں اعلیٰ تعلیم کی وزارت کا قلم دان سنبھالا اور پہلی

خاتون رکن مقرر ہوئیں۔ اس عہدہ پر پارساء نے نہ صرف معیار تعلیم کو بلند کیا بلکہ نصابی کتب میں عورتوں کے متعلق بدترین جنسی تصور وتصویر کی تطہیر کی۔ جب حزب مخالف کی متنوع قیادت یعنی جس میں مسلم ملا، کمیونسٹ اور قوم پرست شامل تھے، نے شاہ کو اقتدار سے محروم کر دیا تو پارساء سابقہ حکومت کے اُن اعلیٰ عہدیداروں میں شامل تھی، جن پر انقلابی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور اسے سزائے موت دی گئی۔ اس مقدمے میں اس پر بدعنوانی، اللہ تعالیٰ سے جنگ اور عصمت فروشی کی فرد جرم عائد کی گئی۔ اسے اپنی صفائی میں کسی وکیل کی اجازت نہ دی گئی اور بے بصیرت ججوں نے اُسے سزائے موت سنا دی۔

اُس وقت نئی انقلابی حکومت نے موت کی سزا پر بہت فخر کیا، اور اُس کی اشتہار بازی کی گئی۔ موت کی سزا پانے والوں کی تصاویر اخبارات میں شائع کیں، مگر ڈاکٹر پارساء کی تصویریں کبھی شائع نہ ہوئیں۔ اس دور میں اس کی موت بھی ایک استثناء تھی۔ ایک روایت کے مطابق مارنے سے پہلے اُسے ایک بوری میں ڈال دیا گیا۔ اس عمل کے پیچھے یہ منطق کارفرما تھی کہ اسلام مرد کو عورت کا جسم چھونے سے منع کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کو موت کی سزا دیتے وقت، سزا نافذ کرنے کے بارے میں کچھ بحث ہوئی۔ کچھ نے کہا اس کو مار مار کر ختم کر دیا جائے۔ دوسروں نے رائے دی کہ اس کو سنگسار کر دیا جائے۔ کچھ کی رائے تھی کہ اسے مشین گن سے اڑا کر ختم کر دیا جائے۔ اُس موت کے طریقہ کار کا مرکزی خیال ایک ہی تھا کہ: ''اُس کے جلادوں کی پارسائی اور وقار کا بھرم کیسے قائم رکھا جائے۔ مجھے پارساء کے بارے میں کئی سال تک خیال نہ آیا، یہاں تک کہ اُس کی موت کی خبر نے اُسے میری یادداشت میں دوبارہ زندہ کر دیا۔ اس وقت سے میں نے اس کی موت کے لمحہ کو بار بار اپنے تصور میں لانے کی کوشش کی۔ میں اُس کے مسکراہٹ اور خفگی والے زندہ چہرے کو دیکھ سکتی ہوں۔ لیکن اس خاص لمحے پر اس کے ناک نقشہ کا تصور نہیں کر سکتی، جب وہ مسکراہٹ اور خفگی سمیت بوری میں گم ہوگئی۔ کیا وہ پیش گوئی کر سکتی تھی کہ اس کی موت کے تھوڑے عرصے بعد ہی اس کی طالبات، اور طالبات کی طالبات کو اسی طرح بے ہئیت اور غیر مرئی بنا دیا جائے گا۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ وہ موت کے وقت شکل وہیت سے محروم ہوئی، جب کہ طالبات زندہ ہوتے ہوئے بھی اس بدنصیبی کا شکار ہوئیں۔ کیوں کہ ملاؤں نے وسیع پیمانے پر تمام ایرانی عورتوں سے یہی سلوک کیا۔ اقتدار سنبھالتے ہی آیت اللہ خمینی نے، بڑی مشقت سے حاصل کیے گئے حقوق نسواں واپس لینے شروع کر

دیے۔ امام خمینی نے اپنے طرزِ عمل کو اس دعویٰ کے ساتھ جائز ثابت کیا کہ یہ عمل حقیقتاً عورتوں کے وقار کو بحال کرنے کے لیے کیا جارہا ہے، انہیں خطرناک اور گھٹیا تصورات سے بچایا جارہا ہے، جو ان پر مغربی سامراج اور اس کے بے دین گماشتوں نے مسلط کیے ہیں اور ان میں شاہ بھی شامل ہے۔

یہ دعویٰ کرتے ہوئے انقلابی حکومت نے نہ صرف ایرانی خواتین کو اُن کے حقوق سے بلکہ اُن کی تاریخ سے بھی محروم کر دیا ہے۔ کیوں کہ ایران میں آزادیٔ نسواں کی حقیقی کہانی بیرونی سامراجی طاقتوں کے خارجی تصورات کا مسلط کرنا نہیں ہے۔ نہ ہی یہ شاہ کی ضیافتوں کی داستان ہے، کہ اس نے اپنی بے زبان نسائی رعایا کو حقوق عطا کر دیے۔ بلکہ آزادی نسواں کی ابتداء خود ایرانی خواتین کی طرف سے ایران کو جدید ملک بنانے کے لیے قومی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اس راستے میں ہر قدم پر درجنوں سادہ خواتین نے بغیر کسی تکلف کے، اپنے ابتدائی کردار کی وسعت کا اندازہ کیے بغیر نئی وسعتیں اور فراخیاں پیدا کیں۔ وہ وسعتیں جو میری نسل کو خود بخود مل گئیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایرانی خواتین سے، جن میں میری نسل بھی شامل ہے، غلطیاں نہیں ہوئیں۔ یا وہ کبھی بھی آزادی کے مقصد سے ڈگمگائی نہیں ہیں۔ اس کے باوجود بعض ایرانی خواتین ایران میں جدیدیت کی طویل جدوجہد میں جاندار قائد تھیں، غالباً ان میں سب سے پہلی خاتون پچھلی صدی کے وسط کی ایک شاعرہ تھی، اس عورت کا نام طاہرہ تھا۔ طاہرہ حیران کن حد تک حسین وجمیل تھی۔ اُس وقت ایران پر مطلق العنان اور نیم جاگیردارانہ قاچار خاندان کی حکومت تھی، جسے بنیاد پرست مسلم ملاؤں کی حمایت حاصل تھی۔ ملاؤں اور حکومت کے گٹھ جوڑ نے مختلف گروہوں کو اسلام کے بنیادی اصولوں سے متعلق سوالات اٹھانے پر اکسایا۔ ان میں ایک گروہ بابیوں کا تھا۔ یہ اُن مسلم علماء کی ایک تحریک تھی، جو بہائیوں کے پیش رو تھے۔ انہوں نے اسلام سے تعلق توڑ کر ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔ یہ لوگ آج تک ایرانی حکومتوں کے منحوس ظلم وستم کا شکار رہے ہیں۔ طاہرہ، بابیوں کے موثر قائدین میں سے تھی۔ وہ پہلی شخصیت ہے، جس نے مذہب کو جدید بنانے کا مطالبہ کیا۔ اس نے اپنے خیالات پر مردوں سے مباحثہ کیا۔ اپنے نظریات کی تشہیر واشاعت کے لیے اس نے ملک بھر کا دورہ کیا۔ اس مقصد کے لیے اپنے بچے اور خاوند چھوڑنے کا عدیم المثال قدم بھی اٹھایا۔ طاہرہ پہلی عورت تھی، جس نے سرعام پردہ ترک کیا۔ یہ حیران کن بات نہیں کہ اپنے خیالات کی قیمت اسے اپنی زندگی کی صورت میں چکانا پڑی۔

۱۸۵۲ء میں خفیہ طورا یک باغ میں لے جا کر اس کا گلہ دبا دیا گیا، اور اُس کے مردہ جسم کو ایک کنویں میں پھینک دیا گیا۔ اُس وقت اُس کی عمر ۳۶ برس تھی۔

جونہی ایران کے مراسم مغرب سے بڑھنا شروع ہوئے، تو آبادی کے بہت سے طبقات مثلاً دانشور، اقلیتیں، علماء حتیٰ کہ عام لوگ مغرب کے مقابلے میں اپنی قوم کی پسماندگی سے آگاہ ہوئے۔ انیسویں صدی کے وسط سے یہ قوتیں ایرانی حکمران کے مقابلے میں جدوجہد کرتی رہیں کہ ایران اپنے آپ کو جدید بنا کر پسماندگی کی اس خلیج کو کم کر سکتا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں یہ جدوجہد بہت آگے بڑھ گئی، جب شاہ نے اس آئین کو برباد کرنے کی کوشش کی، جسے جدیدیت کے حامیوں نے ۱۹۰۶ء میں اس کے پیشرو کو قبول کرنے پر مجبور کیا تھا۔ نئے بادشاہ نے پارلیمنٹ پر حملہ زنی شروع کر دی۔ ایک دفعہ پھر خواتین سب سے آگے تھیں۔ بہت سی خواتین نے عملاً ان جھڑپوں میں حصہ لیا، جو شروع ہو گئیں تھیں۔ بعض اوقات وہ مردوں کا بھیس اختیار کر لیتیں۔ انہوں نے اپنے حجاب میں ہتھیار چھپا کر پارلیمنٹ کی طرف مارچ کیا پارلیمنٹ کے اراکین سے مطالبہ کیا کہ اگر وہ آئین کی حفاظت نہیں کر سکتے تو اپنے منصب چھوڑ دیں۔

آئین پرست جیت گئے۔ اگرچہ آئین میں حقوق نسواں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ پھر بھی اگلے ۲۰ برسوں کے دوران ان گنت خواتین کی پرعزم کوششوں سے اس میدان میں نمایاں پیش رفت ہوئی۔ تحریک نسواں کی اس دور سے متعلق کتب کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس کی اراکین کی جرات اور بہادری قاری کو حیران کر دیتی ہے۔ میں نے ایسی ہی ایک شخصیت کا انتخاب کیا ہے۔ صادقہ دولت آبادی۔ ایک فاضل مذہبی شخصیت کی بیٹی، جن کا تعلق ایک قدیم اور انتہائی قابلِ احترام خاندان سے تھا۔ وہ خواتین کے ایک ماہانہ جریدے کی مدیرتھی۔ ۱۹۱۰ء میں اس کے ساتھ مار پیٹ کی گئی اور اُسے تین ماہ تک جیل میں رکھا گیا۔ اُس کا جرم یہ تھا کہ اُس نے اصفہان میں لڑکیوں کا ایک سکول قائم کیا تھا۔ اس کے دل میں اپنے مخالفین کے خلاف کس قدر غم وغصہ تھا، اس کا اندازہ اس کی وصیت سے کیا جا سکتا ہے۔ جس میں وہ اعلان کرتی ہے: ''میں اُن عورتوں کو کبھی معاف نہیں کروں گی، جو میری قبر پر حجاب کے ساتھ آئیں گی''۔ یہ بات صرف انہی کو زیب دیتی ہے کہ جنہوں نے فاروخرو پارساء کو قتل کیا کہ وہ موت کے بعد بھی صادقہ دولت آبادی کو برداشت نہ کر پائے۔ اگست ۱۹۸۰ء میں پاسداران انقلاب نے صادقہ کے مقبرے کو

مسمار کر دیا، اُس کے باپ اور بھائی کے مقبرے کو بھی روند ڈالا، جنہوں نے اس کی سرگرمیوں میں اس کی حمایت کی تھی۔

یہ ایک امریکی مارگن شسٹر تھا، جس نے دولت آبادی کے دور کی خواتین کی جدوجہد کو بہترین خراج تحسین پیش کیا۔ اُس نے ۱۹۱۲ء میں اپنی کتاب The Strangling of Persia میں لکھا: ۱۹۰۷ء سے ایرانی خواتین دنیا کی سب سے زیادہ ترقی پسند خواتین بن چکی ہیں، ہم انہیں محض انقلابی نہیں کہہ سکتے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس [صادقہ] کے بیان نے ان تصورات کو الٹ دیا ہے، جو صدیوں میں نہیں بدلے جا سکتے''۔

بلاشبہ جدیدیت پسند، مغربی افکار کو ایران لانے میں سنجیدہ دلچسپی رکھتے تھے کیوں کہ تبدیلی لانے والوں میں یہ خواہش ایران کی کمزوریوں کے گہرے شعور کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔

جدیدیت کے عمل کو تیز کرنے کے لیے ایرانی خواتین نے وسیع تر ثقافتی تحریک کی حمایت کی۔ مصنفین اور شعراء نے پرجوش اور گرما گرم مباحث میں قیادت کی، جن میں پرانے فنی اور ادبی اظہار کے طریقوں کو بدلنے پر زور دیا گیا۔ اور بہت سارے ادیبوں نے فارسی زبان کو عوام کی زبان بنانے کا مطالبہ کیا۔ ملاؤں اور مطلق العنانیت کے حامی رجعت پسند عناصر نے ٹھیک ٹھیک پہچان لیا کہ ایسا ثقافتی سرمایہ ان کے غلبہ کے لیے خطرہ بن جائے گا۔ اس لیے انہوں نے ان خیالات کو فوراً مغرب کا زہریلا طوفان قرار دیا، جو ایران کی نوجوان نسل کے ذہنوں کو برباد کر دے گا''۔ اس طرح انہوں نے اس طرز فکر پر حملہ کر دیا۔ ملاؤں کے نزدیک حقوق نسواں کا تصور اسی زمرے میں آتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے ایک ہی سانس میں اس کی مخالفت کر دی۔ دو مشہور مذہبی رہنما شیخ فیض اللہ نوری اور سید علی ششتاری جو آیت اللہ خمینی کے فکری رہنما ہیں، انہوں نے یہ الزام لگا دیا کہ: ''حقوق نسواں کے لیے سرگرم لوگ اور عمومی طور پر جدیدیت کے حامی عناصر مغرب کے گماشتے ہیں''۔ یہ بات مسلمہ طور پر ناانصافی پر مبنی تھی، بلاشبہ وہ مغربی افکار کو ایران لانے میں سنجیدہ دلچسپی رکھتے تھے کیوں کہ تبدیلی لانے والوں میں یہ خواہش ایران کی کمزوریوں کے گہرے شعور کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ایران کی آزادی اور خوشحالی مغرب کے بہترین نظام ہائے حکومت اور فکر کو سمجھنے اور اختیار کرنے میں پوشیدہ

ہے۔ اس فکری نظام کو اپنانے کا ایک مقصد مغرب کا مقابلہ کرنا بھی تھا۔ جب مغرب نے ایرانی دولت اور اس کے قدرتی وسائل کو بے رحمی سے لوٹنا شروع کیا، تو انہی لوگوں نے مغرب کا مقابلہ بھی کیا۔ ایرانی خواتین اس لڑائی میں ہراول دستہ تھیں۔ مثلاً انہوں نے وسیع پیمانے پر ایرانی مصنوعات استعمال کرنے کے حق میں اور غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کی مہم کو منظم کیا۔ انہوں نے قومی آزادی کے لیے مسلسل مظاہرے کیے۔ دراصل کسی بھی گروہ کے مقابلے میں خواتین اس زمانے میں بھی قوم پرستانہ اور سامراج دشمن مزاج کی علامت رہی ہیں، جنہیں کئی عشروں کے بعد سامراج کا ایجنٹ بنا کر شیطان کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔

بعد میں آنے والے برسوں میں جدیدیت کے حامی طاقت ور ہو گئے۔ شاہ رضا پہلوی جس کا خاندان ۱۹۲۵ء میں برسرِ اقتدار آیا، ان کے متعلق خواہ کچھ بھی کہا جائے وہ ایک مخلص جدیدیت پسند تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء میں حکم نامہ جاری کرنے کی کوشش کی تھی کہ تمام خواتین پردہ ترک کر دیں۔ عوامی غیظ و غضب کی وجہ سے جب یہ بات ناکام ہوگئی تو انہوں نے پردہ ترک کرانے کے دوسرے طریقوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اُن کے بیٹے شاہ محمد رضا جو ۱۹۷۹ء کے انقلاب کے وقت ایرانی حکمران تھے، نے اس روایت کو جاری رکھا۔ ۱۹۶۳ء میں انہوں نے خواتین کو رائے دہی کا حق دیا۔ بہرحال یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بادشاہوں اور ملاؤں کے دعوؤں کے برعکس، جنہوں نے ان حقوق کی مخالفت کی تھی، یہ اقدامات اس ترقی کی تائید و تصدیق تھے، جو ایرانی خواتین خود حاصل کر چکی تھیں۔ بے حجابی کے حکمی قانون سے پہلے اور اس قانون کی منسوخی کے بہت عرصہ بعد درجنوں خواتین پردہ ترک کر چکی تھیں۔

۱۹۷۹ء تک خواتین ایران میں زندگی کے تمام شعبوں میں عملی طور پر شریک ہو چکی تھیں۔ سکول جانے والی لڑکیوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ ساتویں عشرے کے پہلے نصف میں یونیورسٹیوں میں خواتین امیدواروں کی تعداد سات گنا بڑھ چکی تھی۔ زندگی کے وہ شعبہ جات جو عام طور پر خواتین کے لیے ممنوع سمجھے جاتے ہیں، ان میں کوٹہ سسٹم کے تحت اہل لڑکیوں کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جاتا۔ خواتین، عالم، پولیس آفیسر، جج، ہواباز اور انجینئر سب کچھ تھیں۔ سوائے مذہب کے وہ ہر شعبہ زندگی میں سرگرم کار تھیں۔ ۱۹۷۸ء میں بلدیاتی کونسلوں کے ۱۶۶۰ امیدواروں میں ۳۳۳ خواتین تھیں۔ ۲۲ عورتیں رکن پارلیمنٹ

منتخب ہوئیں اور دو سینٹ کی ممبر بنیں۔ ایک کابینہ میں وزیر اور تین ذیلی کابینہ میں انڈر سیکرٹری تھیں، جن میں محنت، کانوں اور صنعتوں کی وزارتوں میں بڑے بڑے عہدے شامل تھے۔ ایک گورنر، ایک سفیر اور ایک میئر تھیں۔

امام خمینی نے مذہب کا پرانا ہتھیار استعمال کرتے ہوئے ان پر ایرانی ثقافت اور روایت سے غداری کا الزام لگا کر ان کو فارغ کر دیا۔ یہ کوئی حیران کن بات بھی نہیں ہے۔ حیران کن بات تو یہ ہے کہ انقلابی اتحاد میں بائیں بازو کے عناصر نے بھی خمینی کا ساتھ دیا۔ مشاہدہ ہے کہ بایاں بازو ہمیشہ آمرانہ ذہنیت کے تحت کام کرتا ہے، اور بجائے اس کے کہ تحریک نسواں کی حمایت کرتا یا تنوع پر مبنی طریقہ کار کی تائید کرتا۔ آخر کار رجعت پسند ملاؤں کے تنگ نظر ضابطوں میں زیادہ آسانی محسوس کرتا ہے۔ اس لیے جب امام خمینی نے اپنے تادیبی اقدامات شروع کیے تو بائیں بازو کے عناصر نے ان کی مکمل حمایت کی۔

دوسری طرف اکثر ایرانی خواتین کا رویہ اتنا لچک دار نہ تھا۔ ایک اور تصویر ابھرتی ہے۔ یہ تصویر ایک امریکی جریدے میں چھپی تھی، جس کا نام مجھے یاد نہیں۔ ایرانی انقلاب کے ابتدائی ایام کے تراشوں سے مجھے یہ تصویر ملی ہے، جو میں نے سنبھال رکھے تھے۔ یہ مارچ ۱۹۷۹ء کا ایک برفانی دن تھا۔ اس دن لاکھوں ایرانی خواتین تہران کی کشادہ شاہراہوں پر آ گئیں۔ وہ نعرے لگا رہی تھیں۔ ان کے جذبات قابل دید تھے، لیکن تصویر میں سب سے اہم بات یہ نہ تھی، جس چیز نے میری توجہ کو اپنی طرف کھینچا، وہ آج کی ایرانی خواتین کی تصویر کے برعکس تصویر تھی۔ آج کی ایرانی خواتین بے کیف اور بھدے سیاہ رنگ لبادے میں ملتی ہیں، جبکہ انقلاب کے ابتدائی دنوں کی یہ تصویر رنگوں سے بھرپور تھی۔ عورتوں نے مختلف رنگوں کے ملبوسات پہنے ہوئے تھے، جھلملاتے سرخ اور چمکدار نیلے پیرہن۔ ایسے جیسے انہوں نے سوچ سمجھ کر اپنے آپ کو نمایاں کیا ہو۔ اتنا نمایاں جتنا وہ کر سکتی تھیں، شائد ان کا یہی مقصد تھا۔ کیوں کہ اس دن وہ اس کوشش کے خلاف اپنی مزاحمت اور غصے کا اظہار کرنے کے لیے اکٹھی ہوئیں تھیں جو آیت اللہ خمینی نے انہیں مٹانے کے لیے شروع کیا تھا۔

کچھ دن پہلے آیت اللہ خمینی نے حقوق نسواں پر قدغن لگانے کے اپنے پہلے دور کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے عائلی تحفظ کا قانون منسوخ کر دیا۔ جس نے ۱۹۶۷ء سے خواتین کو گھروں سے باہر

کرنے میں مدد دی تھی، اور عائلی زندگی میں زیادہ حقوق دیئے تھے۔ اس کی جگہ خمینی صاحب نے روایتی اسلامی قانون جسے شریعت کہا جاتا ہے، نافذ کر دیا۔ آیت اللہ خمینی نے ایک ہی ہلے میں ایران کو ایک صدی پیچھے دھکیل دیا۔ نئے نظام کے تحت شادی کے لیے لڑکی کی عمر ۱۸ سال کے بجائے ۹ سال کر دی گئی۔ کوئی خاتون خواہ وہ کتنی ہی عمر کی کیوں نہ ہو، اپنے والد [ولی] کی رضامندی کے بغیر پہلی دفعہ شادی نہیں کر سکتی۔ کوئی شادی شدہ خاتون اپنے خاوند کی تحریری اور قانونی طور پر تصدیق شدہ رضامندی کے بغیر ملک نہیں چھوڑ سکتی۔ بدکاری کی سزا سنگسار کرنا قرار پایا۔ دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر طے کی گئی۔ اگر کوئی مرد کسی عورت کو قتل کر دے، تو اسے سزائے موت دینے سے پہلے عورت کے خاندان کو اس کی زندگی کا معاوضہ ادا کرنا ہوگا، یہ سب کچھ کافی نہ تھا۔ امام خمینی نے حجاب (پردہ) دوبارہ مسلط کرنے کا اعلان کر دیا۔ حکم نامہ جاری ہوا کہ کوئی عورت اپنے آپ کو مکمل طور پر ڈھانپے بغیر کام پر نہیں جا سکتی۔

۸ مارچ کا مظاہرہ خواتین کے بین الاقوامی دن کو منانے کے لیے شروع ہوا۔ جونہی سیکڑوں خواتین سڑکوں پر آ گئیں تو اس کی نوعیت تبدیل ہو گئی، اور یہ حکومت کے خلاف ایک مکمل احتجاجی مارچ میں تبدیل ہو گیا: ''آزادی نہ مغربی، نہ مشرقی، یہ عالمی ہے عالمی''، ''رجعت پسند مردہ باد''، ''ظلم ہر صورت میں، قابل مذمت'' یہ اُن کے نعرے تھے۔ ۸ مارچ کے واقعہ کے بعد مزید مظاہرے ہوئے۔ تیسرے دن وزارت انصاف کے سامنے ایک بہت بڑا مظاہرہ ہوا۔ مختلف تنظیموں اور اداروں کی طرف سے حمایتی اعلانات پڑھے گئے۔ ایک ۸ نکاتی منشور جاری کیا گیا۔ دوسری چیزوں کے علاوہ اس منشور نے اجتماعی اور ذاتی بنیادی آزادیوں کی ضمانت کا بھی مطالبہ کیا۔ اس میں یہ مطالبہ بھی شامل تھا: ''خواتین کے لباس کا تعین رواج، اور جغرافیائی محلِ وقوع کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لیے لباس کا فیصلہ خواتین پر چھوڑ دینا چاہیے''۔

ایسے وسیع تر مظاہروں کے پیش نظر، خمینی پیچھے ہٹ گئے۔ ان کا داماد یہ بتانے کے لیے سامنے آیا کہ آیت اللہ خمینی کا مقصد باوقار لباس پہننے کے لیے خواتین کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ لیکن آیت اللہ کی یہ پسپائی عارضی ثابت ہوئی۔ اگرچہ سرکاری سطح پر انقلابی حکومت نے حجاب کے متعلق اپنے بیان میں نرمی اختیار کر لی، مگر اس کے پاسدارانِ انقلاب نے عوام میں بے پردہ خواتین پر حملے جاری رکھے۔ اکثر ان

پر تیزاب پھینکا جاتا تھا، اور جلد ہی آیت اللہ نے حجاب کا قانون نافذ کر دیا۔ اس دفعہ ایک احتیاط کی۔ فوری طور پر نافذ کرنے کے بجائے، قدم بہ قدم نفاذ کا راستہ اختیار کیا۔ ۱۹۸۰ء کے موسم گرما میں سرکاری دفاتر میں حجاب کو ایک حکم کے ذریعے نافذ کر دیا گیا۔ بعد میں خواتین پر حجاب کے بغیر خریداری پر پابندی لگا دی گئی۔ پہلے کی طرح بہت سی خواتین نے ان اقدامات کی مذمت کی اور احتجاج کیا۔ ایک دفعہ پھر سرکاری غنڈوں نے ان کو مارا پیٹا اور بائیں بازو کی ترقی پسند قوتوں نے ان [عورتوں] کی مذمت کی۔ اس کے بعد مذہب، عقیدہ اور قومیت کی پرواہ کیے بغیر تمام خواتین پر حجاب کی پابندی کا حکم جاری کر دیا گیا۔

آٹھویں عشرے تک بہت زیادہ تشدد کے ذریعے حجاب کو تمام ایرانی خواتین کا لباس بنا دیا گیا۔ اگرچہ اس بات نے رعایا کی زندگیوں پر حکومتی کنٹرول کو مضبوط بنا دیا، لیکن اس قانون نے حکومت اور ایرانی عوام کے درمیان فاصلے بڑھا دیے ہیں۔

آٹھویں عشرے تک بہت زیادہ تشدد کے ذریعے حجاب کو تمام ایرانی خواتین کا لباس بنا دیا گیا۔ اگرچہ اس بات نے رعایا کی زندگیوں پر حکومتی کنٹرول کو مضبوط بنا دیا، لیکن اس قانون نے حکومت اور ایرانی عوام کے درمیان فاصلے بڑھا دیے ہیں۔

نئے قوانین کو نافذ کرنے کے لیے حکومت نے خصوصی نگران جتھے قائم کیے، جو اخلاقی جرائم کے مرتکب افراد کی نگرانی کرنے کے لیے شہروں میں گشت کرتے تھے۔ پاسدارانِ انقلاب کو نہ صرف اجتماعی جگہوں پر چھاپے مارنے کی اجازت تھی، بلکہ وہ الکوحل والے مشروبات، موسیقی اور ویڈیو فلموں، تاش کھیلنے والے لوگوں، مخلوط جنسی پارٹیوں اور بے حجاب خواتین کی تلاش میں رہائش گاہوں پر بھی چھاپے مار سکتے تھے۔ جو لوگ گرفتار کیے جاتے، انہیں عدالتوں میں لے جایا جاتا اور فوری طور پر سزائے قید سنا کر جیل بھیج دیے جاتے۔ اس کا یہ نتیجہ یہ نکلا کہ عام ایرانی شہریوں، مردوں اور عورتوں دونوں نے اپنے انتہائی ذاتی معاملات میں حکومتی موجودگی اور مداخلت کو محسوس کرنا شروع کر دیا۔ یہ اہلکاران مجرموں کو گرفتار کرنے کے لیے نہیں تھے جو عام شہریوں کی جان و مال کے لیے خطرہ تھے۔ وہ عوام کو قابو میں رکھنے، اٹھا لینے، کوڑے برسانے اور اُن کو جیل میں بند کرنے کے لیے تھے۔ بازاروں اور خریداری کے مراکز کو گھیرے میں لے لیا جاتا، اور چھاپے مارے جاتے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں گلیوں میں اکٹھے گھومنے اور نامناسب لباس پہننے پر گرفتار کر لیے

جاتے۔ نیل پالش اور ری بوک (reebok) جوتے مہلک ہتھیار سمجھے جاتے۔ نوجوان لڑکیوں کے کنوار پن کی تصدیق کے لیے طبی معائنہ کیا جاتا۔

جلد ہی وہ عوام جنہوں نے انقلاب کی حمایت کی تھی انہوں نے اعتراض کرنا شروع کر دیا۔ حکومت نے دعویٰ کیا کہ ''صرف مٹھی بھر مغرب زدہ خواتین نے اس کے قوانین کی مخالفت کی ہے''۔ مگر اب انقلاب کے بیس سال کے بعد اس کے سب سے بیباک اور جرات مند مخالفین خود انقلاب ہی کے بیٹے ہیں۔ جن میں بہت سے طلبہ اسلامی تنظیم کے سرگرم اراکین تھے۔ اعداد و شمار کی ایک مثال یہ ہے کہ جولائی ۱۹۸۳ء میں فسق و فجور روکنے والے دستوں نے ۸۰۲ مرد اور عورتوں کو نظر بند کر دیا۔ ان میں ۸۰ فیصد ۲۰ سال سے کم عمر کے تھے۔ مغرب کے ''ثقافتی حملے'' سے دفاع کے نام پر ثقافت کو دبانے اور جبراً اسلام نافذ کرنے کی کوشش نے نوجوان نسل کے ذہن پر اسی ثقافت کا خبط مسلط کر دیا ہے جس سے اُن کو محروم کیا جا رہا ہے۔

حکومت نے دعویٰ کیا کہ ''صرف مٹھی بھر مغرب زدہ خواتین نے اس کے قوانین کی مخالفت کی ہے''۔ مگر اب انقلاب کے بیس سال بعد اس کے سب سے بیباک اور جرات مند مخالفین خود انقلاب ہی کے بیٹے ہیں۔

حکومت نے بہت ساری ایسی روایتی خواتین کو بھی اپنا مخالف بنالیا ہے، جنہوں نے شروع میں اس کی حمایت کی تھی۔ یہ خواتین ایسی راسخ العقیدہ مسلمان تھیں، جو ایک صدی سے جاری لادینیت اور مغربیت کے فروغ کے عمل سے پریشان تھیں، اور انہوں نے انقلاب کی راہ ہموار کی تھی جب آیت اللہ خمینی پہلی بار سیاست پر ابھرے تو ان عورتوں نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ یہ طبقہ اسی آیت اللہ خمینی کا طاقت ور حلیف تھا، جس نے ۱۹۶۳ء میں خواتین کے حقِ رائے دہی کی پرجوش مخالفت کی تھی، مگر اب اسے ان خواتین کے ووٹوں پر انحصار کرنے کے لیے اپنے موقف کو تبدیل کرنا پڑا۔ انقلاب کے بعد ایسی بہت سی خواتین نے نوکریوں کے لیے قسمت آزمائی کی۔ کیوں کہ اب دفاتر کا ماحول کافی حد تک اُن کے روایتی طرز زندگی سے ہم آہنگ ہو چکا تھا۔ ان دفاتر میں ان کا سابقہ ایسی سیکولر اور آزاد خیال خواتین سے پڑا، جو شاہ کی حکومت کا حصہ نہیں رہی تھیں۔ مگر نظام حکومت کو چلانے کے لیے اُن کے تجربے اور علم سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور اُنہیں دفاتر میں کام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ ان روایت پسند خواتین نے محسوس کیا کہ اُن اور اُن لادین خواتین کے درمیان بہت ساری چیزیں مشترک ہیں جن پر وہ مغرب زدہ ہونے کی وجہ سے تنقید کیا کرتی تھیں۔ ''اپنے'' اور ''ان'' کے درمیان خط امتیاز آہستہ آہستہ تحلیل ہو گیا۔

ایک قانون کے مسئلہ نے ان کے درمیان تعلق کو مضبوط بنا دیا۔ روایت پسند خواتین کے نزدیک حجاب کا جبری نفاذ اُن کی مذہبیت کی توہین تھی۔ مذہبی عقیدہ کا اپنی آزادانہ مرضی سے انتخاب کر کے، اس کے احکام کی پابندی کے اظہار کو ریاست کی طرف سے مسلط کرنے کی کوشش نے ایک احمقانہ مشق میں تبدیل کر دیا۔ ایسی ہی مذہبی خواتین میری دادی جان بھی تھیں جنہوں نے تمام عمر اپنی چادر کو اپنے جسم سے الگ نہیں کیا تھا۔ وہ ان لوگوں پر بہت ناراض تھیں، جنہوں نے ان کے پوتے پوتیوں پر اپنی پسندیدہ مذہبی تعبیر مسلط کرنے کے لیے تشدد اختیار کر کے مذہب کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ وہ اصرار کرتی تھیں کہ یہ اسلام نہیں ہے۔

روایت پسند خواتین کے نزدیک حجاب کا جبری نفاذ اُن کی مذہبیت کی توہین تھی۔ مذہبی عقیدہ کا اپنی آزادانہ مرضی سے انتخاب کر کے، اس کے احکام کی پابندی کے اظہار کو ریاست کی طرف سے مسلط کرنے کی کوشش نے ایک احمقانہ مشق میں تبدیل کر دیا۔

ان قوانین اور جدید ایران کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش بے ثمر رہی ہے اسی لیے وہ کشادہ دل لوگ بھی فاصلے پر چلے گئے ہیں، جو اس نظام حکومت کے حامی ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو حکومتی پالیسیوں سے فاصلے پر رکھ کر، دوسری جانب وابستگی کا سفر شروع کر دیا ہے۔ اس فکری تبدیلی کی قابل ذکر مثال، خواتین کے سرکاری جریدے ''زنِ روز'' کے مدیر اور عملہ ادارت کی ہے جنہوں نے نویں عشرے کے وسط میں ادارے سے تعلق توڑا، اور نیا پرچہ ''زنان'' جاری کیا۔ جو حکومت کی پالیسیوں اور اقدامات کا سخت ناقد ہے۔ انہوں نے لادینیت پسند خواتین کو دعوت دی ہے کہ وہ ان کے اشاعتی پروگرام میں تعاون کریں۔ مذہبی عناصر تک تعلق رکھنے والے افراد نے، آگے بڑھ کر ان سے تعاون کیا ہے، اور رجعت پسندانہ قوانین کی مخالفت کی ہے، تاکہ ملک میں سول معاشرے کو رواں کیا جا سکے۔

اسی دوران دوسری روایت پسند عورتوں نے بھی شریعت سے منسوب بعض دہشت ناک پہلوؤں

سے بے زاری کا اظہار شروع کر دیا ہے۔ ایرانی معاشرے میں اسلامی قوانین کی تعبیر اور تجزیے پر مبنی مباحثہ زور پکڑ چکا ہے۔ اسی طرح مزید چند پہلوؤں پر بحث نے شدت اختیار کر لی ہے کہ جس میں سب سے اہم موضوع یہ ہے کہ نجی اور عوامی مقامات پر عورت اور مرد کے تعلقات کا دائرہ کیا ہے؟ انقلابی حکومت نے اس ضمن میں قوانین کو، اس بنیاد پر تبدیل کیا تھا کہ نادرست ہیں اور دشمن تہذیب کے حامی حکموں اور مظاہر پر مبنی ہیں۔ آج، زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والی خواتین ان قوانین کی بڑے پیمانے پر مزاحمت کر رہی ہیں۔ کیوں کہ یہ قوانین، خواتین کے بنیادی حقوق کے تحفظ میں ناکام ہیں، بلکہ انہیں پامال کرتے ہیں۔ سابقہ وزیراعظم ایران میر حسین موسوی کی اہلیہ زہرہ راہ نورد جو اسلامی حکومت کی پرجوش حامی رہی ہیں، اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا: ''اسلامی حکومت حجاب (پردے) کی جنگ ہار چکی ہے ---اسلامی اقدار عورتوں کو تحفظ دینے اور ان کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں''۔

یہ حکومت اپنے تحفظ کے لیے اپنی حامی خواتین سے زیادہ، دوسری ایرانی خواتین کی حمایت حاصل کرنے کی خواہاں ہے۔ دیکھا جائے تو یہ حکومت ''شیطان بزرگ'' [امریکہ] سے تعلقات کی بہتری کے لیے تدابیر اختیار کر رہی ہے۔ لیکن اپنی ہم وطن خواتین پر اپنے نافذ کردہ ضابطوں میں تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہے۔ ان کے دماغوں میں یہ بات سما چکی ہے کہ ایران کی گلیوں میں کسی ایک بے حجاب عورت کا وجود، زیرزمین حزب اختلاف کے دستی بموں سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس چیز کو عورتیں سمجھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان لڑکیاں، حجاب کو اس وقت ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہیں، جب بعض اوقات وہ اسے بطور احتجاج اتارتی ہیں۔ یا پھر مثال کے طور پر وہ حجاب کو ایک پرکشش اور توبہ شکن پہناوے میں ڈھال دیتی ہیں۔ وہ اپنے اسکارف کے نیچے سے اپنی زلفوں کی لٹ باہر لہرا دیتی ہیں۔ اسی طرح وہ بہانے ہی بہانے اپنے گریبان سے خوش رنگ لباس کی نمائش کا وسیلہ فراہم دیتی ہیں۔ وہ قانون شکنی کے سے انداز سے چلتی ہیں، اور اپنے ہر فعل سے انتظامیہ کو باور کراتی چلی جاتی ہیں کہ: ''وہ [حکومت] ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہی ہے''۔

اب میں ایک آخری حوالہ دوں گی۔ ۱۹۹۷ء کی بات ہے۔ فٹ بال کے عالمی کپ کے پہلے کوالی فائنگ مقابلوں میں ایرانی ٹیم نے آسٹریلوی ٹیم کو ہرا دیا۔ حکومت نے مقابلے میں پہلے خبردار کر دیا تھا کہ

جیت کی صورت میں سیکولر انداز میں خوشی نہ منائی جائے۔لیکن جونہی ایرانی فٹ بال ٹیم جیتی تو لاکھوں ایرانی بے ساختہ گلیوں میں نکل آئے۔وہ گا رہے تھے، رقص کر رہے تھے اور اونچی آواز میں موسیقی نشر کر رہے تھے۔کچھ عورتوں نے تو حجاب اتار کر اس خوشی میں حصہ لیا۔اسٹیڈیم میں داخلے کے لیے جہاں پولیس نے رکاوٹ پیدا کی، انہوں نے اسے بھی توڑ دیا۔اس پورے عمل کو ایرانی لوگ ''فٹ بال کا انقلاب'' کہتے ہیں۔وہ ایرانی قوم جس کے سامنے سیاسی اظہار کا کوئی ذریعہ یا علامت نہ تھی، انہوں نے اپنے باطن میں چھپے ہوئے جذبات کو اس غیر سیاسی موقع پر بھرپور انداز میں استعمال کیا۔ان کا یہ رویہ سراسر سیاسی عمل تھا، جس میں وہ بہت کچھ کہہ گئے۔عام طور پر صدر خاتمی اور ان کے حامیوں کا مغرب میں نوٹس لیا جاتا ہے، حالانکہ فٹ بال جیسے مقابلوں میں ایرانیوں کے ردعمل میں امکانات اور اظہار کا بھرپور مظاہرہ موجود ہے، مگر مغرب صرف ٹھیٹ سیاسی اقدامات سے نتائج اخذ کرنے کو بنیاد بناتا ہے۔

> صدر خاتمی نے [جدید] شہری معاشرے کی تعمیر کے لیے قانون کی عمل داری کرانے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن کون سا قانون؟ وہی قانون جس کے خلاف ایرانی احتجاج کر رہے ہیں۔جس کے تحت زانی کو سنگسار کیا جاتا ہے۔اہل قلم اور حزب مخالف کے اہم لوگ مار دیے جاتے ہیں۔ بہائی انسانی حقوق سے محروم اور پسا ہوا طبقہ ہیں۔

صدر خاتمی نے اہل مغرب کو متاثر کیا ہے، کہ وہ [جدید] شہری معاشرے کی تعمیر کے لیے قانون کی عمل داری کرائیں گے۔ لیکن کون سا قانون؟ وہی قانون جس کے خلاف ایرانی احتجاج کر رہے ہیں۔جس قانون کے تحت زانی کو سنگسار کیا جاتا ہے۔اہل قلم اور حزب مخالف کے اہم لوگ نہ صرف گرفتار کیے جاتے ہیں، بلکہ مار دیے جاتے ہیں۔بہائی انسانی حقوق سے محروم اور پسا ہوا طبقہ ہیں۔پاسداران انقلاب اور پولیس ایرانی شہریوں کے ساتھ ایسی سختی و درشتی سے پیش آتی ہے، جس کی پہلے کوئی مثال نہ تھی۔لیکن یہ تمام اقدامات کسی مضبوطی کے نہیں، بلکہ کمزوری کی علامت ہیں۔ماضی میں بھی احتجاج روکنے کے تمام طریقے ناکام رہے تھے، اور عورتوں نے تبدیلی کے عمل میں اپنا فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔بیس برس گزرنے کے بعد آج پھر، ایرانی عورت فیصلہ کن کردار ادا کرنے کے لیے میدان میں موجود ہے۔

درحقیقت ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک خوبصورت فنکارانہ ربط ومطابقت پائی جاتی ہے۔ میری مراد ہے، بیسویں صدی کے آغاز اور بیسویں صدی کے اختتام پر ایرانی عورت کے کردار اور جدوجہد کے بارے میں- بظاہر یوں لگتا ہے کہ مستقبل میں [ایرانی عورت کی] جدوجہد کا سرا دکھائی نہیں دیتا، لیکن مجھے اس میں کوئی غیر یقینی پن نظر نہیں آتا۔ مجھے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب ایڈگر ڈیگاس کی مصوری کے شاہکار پر رقاصائیں اپنی اصل جگہ پر آ جائیں گی۔

[آزر نفیسی تھران یونیورسٹی کی انگریزی کی سابق پروفیسر ھیں۔ اور آج کل جان ہوپکنز سکول آف ایڈوانسڈ انٹرنیشنل اسٹڈیز میں وزٹنگ پروفیسر ھیں۔]